کلونیل اور پوسٹ کلونیل صرفی سماج

(علامہ محمد اقبال کی 'مثنوی پس چہ باید کرد اے اقوام شرق' کی روشنی میں)

ڈاکٹر سعادت سعید

The stage of world has shifted after Western renaissance. It is the day of market economy now. The desire to follow West is at peak in the third world countries. In these circumstances, the rest of the world i.e. East is increasingly afflicted with lack of self consciousness and self awareness. The slogan of "modernity" has risen from the West in which it is stated that the world is moving towards a certain system which has never been experienced before by mankind. What did Iqbal want in these circumstances and how did he want to lead the humankind? Focus has been made on this particular issue in this article, particularly with reference to Iqbal's poetic work, Pas Cheh bayad kerd.

مغرب آج مادی ترقی اور خوشحالی کے اعتبار سے انتہائی منزلوں کی جانب گامزن ہے۔ اس نے اپنے حیرت ناک سائنسی اور تکنیکی کمالات کی بدولت دنیا کو ششدر و حیران کر رکھا ہے۔ تیسری دنیا کی بیشتر حکومتیں عوام اور دانشور مغرب کے طلسم میں یوں کھو چکے ہیں کہ انھیں مغربی نقالی کے علاوہ کوئی اور راستہ سجھائی نہیں دیتا۔ مادی، سائنسی تکنیکی اور تہذیبی برتری کی یہی وہ زنجیریں ہیں جنھوں نے تیسری دنیا کو بے دست و پا بنا رکھا ہے۔ مغرب کا اپنی تہذیبی برتری پر اصرار بے بنیاد نہیں ہے آخر انھوں نے محنتی ہاتھوں کو مشین سے اور مشقتی دماغوں کو کمپیوٹر سے تبدیل کیا ہے۔ دستکار یا دماغ سوزی کرنے والے مہذب یا برتر ہوتے کیسے ممکن تھا؟ چنانچہ مغرب کے ارباب بست و کشاد ہی نہیں عوام بھی تہذیب کی علامت بن گئے محض اس لیے کہ ان کے پاس مشین تھی ان کے پاس تازہ ترین ہتھیار تھے ان کے پاس جدید ترین دماغ تھے۔ مغرب کی برتری اور تہذیبی عروج کا نقطہ آغاز ان کی نشاۃ ثانیہ ہے۔ اس سے قبل یہی مغرب جہالت کی تاریکیوں میں ڈوبا ہوا تھا۔ بھوک، قحط اور وباؤں کے چنگل میں پھنسا ہوا تھا باہمی جنگیں نظریاتی تنازعے، کٹھ

ملائیت، علم دشمنی، بے مقصدیت اور انسان کشی مغربی معاشروں کا خاص مقدر تھے۔ اچانک اسے تہذیب کے طلسم نے آ لیا۔ انھوں نے توانائی کا نیا استعمال سیکھا اور یوں دنیا کو اپنا براہ راست مطیع بنانا شروع کیا۔ نشاۃ ثانیہ کو زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا کہ معلوم ہوا کہ مغرب دنیا کے مختلف علاقوں پر غالب آ گیا ہے۔ دھیرے دھیرے اس نے دنیا بھر کے پسماندہ اور مادی و تکنیکی ترقی سے عاری معاشروں کو اپنی نو آبادیاں بنالیا۔

مغربی نشاۃ ثانیہ نے اولاً یورپ کو صنعتی انقلاب سے نوازا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس کے پاس نیچر کو مسخر کرنے اور مشینی طاقت کے ذریعے دنیا پر غلبہ پانے کے لامحدود ذرائع آ گئے۔

ایسا کیونکر ممکن ہوا؟ اس لیے کہ دستکارانہ معیشت مشین کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھی۔ دس گز تک مار کرنے والی بندوق سو گز تک گولی پہنچانے والی بندوق کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھی۔ دستکار سو چیزیں بناتے تھے تو مشین لاکھ بناتی تھی۔ جب مشین نے ضرورت اور مقامی لوگوں کی معاشی حیثیت سے زائد چیزیں پیدا کرنی شروع کیں تو صنعتکاروں اور صنعتی ملکوں نے اپنا رخ ان عالمی علاقوں کی جانب کیا جن پر ان کی فاضل اشیا مسلط ہو سکتی تھیں۔ پچھلے تین سو برس کی کہانی کی بنیاد یہی ہے۔ اس کی بدولت مغرب کو باقی دنیا پر اقتصادی اور فوجی غلبہ حاصل کرنے کا موقع ملا۔ برطانوی سامراجیت کے دور کے خاتمے کے بعد نئی تجارتی سامراجیت نے دنیا پر غلبہ و تسلط کے لیے نئے طریق ہائے کار اپنائے اور آج یہی پرانے شکاری نیا جال لے کر آئے ہیں۔ اقبال کے معنوی شاگرد ڈاکٹر علی شریعتی نے (۱) تہذیب اور آئیڈیالوجی (۲) مشین میکانکیت کے حصار میں (۳) سائنسی علوم میں طریق کار (۴) ذات کے بغیر انسان، بے گانگی کے دو تصورات (۵) اقدار میں انقلاب (۶) سائنس یا نئی مدرسیت۔ (۷) نشاۃ ثانیہ کی معاشی اور طبقاتی جڑیں۔ (۸) جدید تمدن اور انسان وغیرہ کے موضوعات پر اپنے فارسی مضامین میں اور علامہ اقبال نے اپنی مثنوی ''پس چہ باید کرد اے اقوام شرق'' اور کئی دوسری نظموں میں مغربی سامراجیت کے مختلف پہلوؤں کا فکری اور منطقی تجزیہ کیا ہے اور یہ نتیجہ نکالا ہے کہ

> ''یورپ میں امراء اور سرمایہ داروں کی مدد سے سترہویں، اٹھارہویں اور انیسویں صدی کے دوران مشینوں نے ترقی کی، مشین متواتر کھپت کی ضرورت پیدا کرتی ہے۔ سو زائد یا فاضل پیداوار کے لیے قومی حدود سے نکل کر بین الاقوامی منڈیوں کی ضرورت پیش آئی، یوں یہ طے کر لیا گیا تھا ''اس زمین پر بسنے والا ہر انسان کارخانوں میں تیار ہونے والی تجارتی اشیا کا صارف ہو کے رہے گا'' ایشیا اور افریقہ کے لوگوں کو صارف بنانے کے لیے ان معاشروں کو بدلنے کی ضرورت پیش آئی ''مقامی انسان کے لباس، کھپت کے طریقے، سامان آرائش، رہائش اور شہر کو تبدیل کرنے کے لیے ضروری تھا کہ ان معاشروں کی قلب ماہیت کی جاتی۔''(۱)
> ''تا کہ یورپی، افریقی اور ایشیائی معاشرے یا بالفاظ دیگر دنیا کے تمام انسان باہمی طور پر ہم آہنگ ہو سکیں۔

اقوام عالم کی روحوں اور سوچوں کے اختلافات کو ختم کرنے کے لیے انھیں ایک سانچے میں ڈھالنا ضروری تھا یوں جدیدیت کے نام پر دنیا کو ایک نئی تہذیب کی خوش خبری دی گئی۔''

اس جدیدیت کی یلغار دانش وعلم کے وسیلے سے کی گئی تاریخ، اخلاقیات، نفسیات، معاشیات، سماجیات، ادب وفن اور سائنسی علوم میں نئے نظریات کو فروغ دیا گیا اور مقامی دانشوروں اور درسگاہوں میں انھیں رائج کیا گیا۔ یوں ایسے لوگ پیدا ہوئے جو اپنی تہذیب سے بے گانہ ہو گئے تھے اور مغربی تہذیب کے چنگل میں پھنس گئے تھے۔ ژاں پال سارتر افتادگان خاک کے دیباچے میں لکھتے ہیں: ''یورپی دانشوروں نے دیسی دانشوروں کا ایک خاص طبقہ ڈھالنے کا تہیہ کیا۔ انھوں نے ہونہار نوجوانوں کا انتخاب کیا انھیں مغربی تہذیب کے اصولوں سے داغا۔۔ اس طرح جیسے گرم لوہے سے داغتے ہیں۔ ان کے منہ میں بلند آہنگ فقرے ٹھونسے۔ شاندار چپچپے الفاظ بھرے جو دانتوں سے چپک کر رہ گئے'' پھر سارتر لکھتے ہیں۔

''ہم ایمسٹرڈم اور پیرس میں افریقیوں یا ایشیائیوں کی ایک جماعت کو لائیں چند مہینوں کے لیے انھیں گھمائیں پھرائیں۔ ان کے کپڑوں اور آرائش و زیبائش کو تبدیل کریں۔ انھیں آداب اور معاشرتی اطوار بھی سکھائیں اور زبان کے کچھ حصے بھی۔ مختصر یہ کہ ہم انھیں ان کی اپنی تہذیبی اقدار سے عاری کر دیں اور پھر انھیں واپس ان کے اپنے ملکوں میں بھیج دیں تو اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ وہ ایسے اشخاص نہیں رہیں گے کہ وہ اپنے دماغ سے سوچیں۔ فی الحقیقت وہ ہمارے نمائندے ہوں گے ہم یہاں انسانیت اور مساوات کے نعرے بلند کریں گے اور وہ ہماری آواز کی گونج افریقہ اور ایشیا میں سنائیں گے ''انسانیت'' ''مساوات'' ''انسانیت، مساوات'' (۲)

مقامی علاقوں کے ایسے دانشوروں اور یورپی نظریات پر مشتمل کتب نے ایشیا اور افریقہ کے لوگوں کو ان کی قدیم تہذیب سے علیحدہ کیا اور کہا کہ وہ اپنی دقیانوسیت سے نجات پائیں اور مذہب کو بالائے طاق رکھ دیں اور سرتاپا مغربیت زدہ ہو جائیں۔ ایرک فرام، ہربرٹ مارکیوز، فرانز فینن اور ژاں پال سارتر کے خیالات کے مطابق یورپی دانشوروں نے تمام دنیا کے تمدن کو ایک سانچے میں ڈھالنے کی کوشش اس لیے نہیں کی کہ وہ دنیا کو مہذب اور روشن خیال بنانا چاہتے تھے، انسانوں کو عزت و تکریم سے نوازنا چاہتے تھے، انھیں بھائی چارے، مساوات اور محبت کی قدروں سے آشنا کرنا چاہتے تھے۔ ان کو اشرف اور نائب خدا بنانا چاہتے تھے بلکہ ان کا اصل مدعا یہ تھا کہ ان کے کارخانوں کی پیداوار کے لیے عالمی گاہک پیدا ہو سکیں۔ دنیا کی دولت سمیٹنے کا یہ نیا طریق کار تھا۔ یوں کئی سونے کی چڑیائیں محض راکھ کا ڈھیر ہو کے رہ گئیں۔ مغرب نے اعلیٰ انسانی معیارات تو اپنے لیے وقف کر لیے اور مشرق سے اس کے ارادے، انتخاب کی صلاحیت، آرزوئیں اور تمنائیں چھین لیں۔

فرانز فینن نے الجزائر کی آزادی کے حوالے سے افتادگان خاک'' اور الجزائری انقلاب کا پانچواں

سال کے نام سے دو کتب لکھیں۔ فرانز فینن کا کہنا تھا مقامی باشندوں کو یورپ کی مکروہ نقالی سے باز رہنا چاہیے۔

''یورپ کو اپنے حال پر چھوڑ دو کہ وہاں لوگ انسانیت کے موضوع پر بات کرتے نہیں تھکتے لیکن اپنی سڑک کے ہر موڑ پر یا دنیا کے گوشے گوشے میں جہاں بھی انھیں انسان نظر آتا ہے اسے قتل کر دیتے ہیں۔ صدیوں تک انھوں نے نام نہاد روحانی واردات کے نام پر کم وبیش پوری انسانیت کا گلا گھونٹے رکھا''۔(۳)

ذرا انھیں آج دیکھیے کہ وہ ایٹمی اور روحانی انتشار کے درمیان لٹک رہے ہیں۔ علامہ اقبال نے تہذیب مغرب کے حوالے سے درست کہا تھا کہ یہ شاخ نازک پر بنا ہوا آشیانہ ہے جو زیادہ دیر تک قائم نہیں رہ سکے گا۔ ہمارے عہد کے دیگر کئی مفکرین بھی اعلان کر چکے ہیں کہ

''اب یورپی کھیل ختم ہو چکا ہے ہمیں کچھ اور تلاش کرنا چاہیے۔''(۴)

آج ہم سب کچھ کر سکتے ہیں بشرطیکہ ہم یورپ کی نقالی نہ کریں بشرطیکہ ہم یورپ کی ہمسری کی خواہش کے خبط میں مبتلا نہ ہوں''

آج ایک بڑی طاقت ساری دنیا کو ایک سانچے میں ڈھالنا چاہتی ہے اس کے لیے اس نے دیگر تمام طریقوں کے ساتھ ساتھ سی این این کا سہارا بھی لے رکھا ہے۔

اقبال چاہتے تھے کہ مشرقی عوام ہدایت و دانش کی جانب لوٹیں اپنے ذہنوں اور قوتوں کو نئی سمتوں کی جانب موڑیں اور اس مکمل انسان کا سراغ لگائیں جو نہ تو یورپ میں موجود ہے اور نہ ہی موجودہ مشرق میں۔ مشرق کو بقول اقبال مادی عقل کی نہیں عشق کی ضرورت ہے مشرق کو بوجھل نیند سے جاگنا چاہیے۔ اور اپنی پرانی زنجیریں کھول دینی چاہیے۔ صارفیت کے پرانے بت کدوں کو توڑ دینا چاہیے اور نئے خیالات وافکار کی کائنات تلاش کرنی چاہیے۔ جب تک لوگوں کی فکر محض آب وگل تک محدود رہے گی حقیقی انسانی منزل دور رہے گی۔

ڈاکٹر علامہ اقبال نے اپنی مثنوی پس چہ باید کرد اے اقوام شرق میں لکھا ہے: (۵)

خوش بیا صبح مراد آوردہ ئی ہر شجر را نخل سینا کردہ ئی
زندگی از گرمیِ ذکر است و بس حریت از عفت فکر است و بس
چوں شود اندیشۂ قومے خراب ناسرہ گردد بدستش سیم ناب
میرد اندر سینہ اش قلب سلیم در نگاہ او کج آید مستقیم
بر کراں از حرب و ضرب کائنات چشم او اندر سکوں بیند حیات
موج از دریاش کم گردد بلند گوہر او چوں خزف نا ارجمند
پس نخستیں بایدش تطہیر فکر بعد ازاں آسان شود تعمیر فکر

ترجمہ (دنیا کو روشن کرنے والے سورج) ''خوش آمدید تو صبح مراد لایا ہے اور تو نے ہر نخل کو نخل سینا بنا دیا

ہے۔ زندگی ذکر کی گرمی ہی تو ہے۔ آزادی فکر کی پاکیزگی ہی تو ہے۔ جب کسی قوم کا فکر خراب ہو جاتا ہے تو اس کے ہاتھ کی خالص چاندی بھی غیر ہو جاتی ہے۔ اس کے سینے میں قلب سلیم مر جاتا ہے۔ اس کی نگاہ میں مستقیم بھی ٹیڑھا ہو جاتا ہے۔ وہ کائنات کی حرب وضرب سے گریزاں ہوتا ہے۔ اس کی آنکھ سکون میں زندگی دیکھتی ہے۔ اس کے دریا سے موج کم ہی اٹھتی ہے۔ اس کا گوہر ٹھیکری کی مانند نا مبارک ہو جاتا ہے۔ پہلے فکر کی تطہیر ضروری ہے۔ اس کے بعد اس کی تعمیر آسان ہو جاتی ہے۔''

فکر کی جس تطہیر کی جانب علامہ اقبال نے اشارہ کیا ہے۔ اسی تطہیر کی تمنا کئی اور مشرقی مفکروں نے بھی کی تھی۔ وہ بھی چاہتے تھے کہ اسلامی اور مشرقی معاشروں کا ہر فرد روحانی اور باطنی طور پر منور ہو۔ اس کی فکر پاکیزہ ہو تا کہ وہ اپنی حقیقی آزادی کو محسوس کر سکے۔ قومی فکر اگر خراب ہے تو اس کو درست کرنے کے لیے ایسے روشن خیال دانشوروں کی ضرورت ہے جو نگاہوں میں موجود مستقیم راستوں کو ٹیڑھا ہونے سے بچائیں۔ وہ لوٹ کھسوٹ اور سینہ زوری کے خلاف ہوتے ہیں۔ غلام ساز نظاموں سے نبرد آزما ہونے کا درس دیتے ہیں۔ ہمہ وقت متحرک اور مضطرب رہتے ہیں۔ یورپی اور مغربی نظاموں میں موجود امتیازات، طبقاتی ناہمواری، قومی برتری وغیرہ کے تصورات کی بدولت جس نسل پرستی، غلامی اور استحصال کو روا رکھا گیا ہے اس کا قلع قمع کرنے کے لیے بے قرار ہوتے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ مقامی عوام نئی دریافتیں کریں۔ خود ایجادات کریں۔ اپنا نظام خود تشکیل دیں۔ فکر کی تطہیر کرنے والے روشن خیال دانشور چاہتے ہیں کہ زمین کی نعمتیں اور پاکیزہ چیزیں سب انسانوں کے لیے ہوں۔ اجارہ دار اور قابض افراد مظالم کا ارتکاب کر رہے ہیں۔ ہر انسان کی ضروریات زندگی پوری ہونی چاہئیں۔ علامہ اقبال نے اس حوالے سے ایک آزمودہ سوشل نظام کا خاکہ پیش کیا ہے جو جدید دور میں انسانی زندگی کے تقاضے پورے کرتا ہے۔ وہ چاہتے تھے کہ تمام انسان حق خلافت سے مجموعی اور یکساں طور پر بہرہ مند ہوں۔ دنیاوی معاملات انسانی فلاح کے حوالے سے طے ہونے چاہئیں تمام علوم وفنون اور افکار وخیالات کو خیر کا جویا ہونا چاہیے۔

فکر کی تطہیر میں رزق حلال اور روحانی ارتقا کے خیالات بھی شامل ہیں۔ یہ خیالات اور تصورات ایک اعلی سماج میں پایہ تکمیل کو پہنچ سکتے ہیں۔ روائتی معاشروں کا عمومی طور پر اور مسلم معاشروں کا خصوصی طور پر سنگین المیہ یہ ہے کہ اس میں عوام الناس اور پڑھے لکھے طبقے میں نقطۂ نظر کا اختلاف اور باہمی ابلاغ کی کمی موجود ہے۔ اس لیے ایک پسماندہ سماج کی تعمیر نو کے لیے ضروری ہے کہ دانشوروں کے فکر وعمل میں تضاد موجود نہ ہو۔ وہ لوگ جو اپنے معاشرے کی تعمیر نو چاہتے ہیں اور غیر متحد لوگوں اور بسا اوقات اپنے معاشرے کے دشمن عناصر کو متحد کرنا چاہتے ہیں یا انھیں ایک ہم آہنگ کل میں ڈھالنا چاہتے ہیں انھیں چاہیے کہ وہ ان دو متوازی حدوں یعنی نظریہ اور عمل کے مابین موجود فاصلوں کو کم کریں۔ عوام اور دانشوروں

کے درمیان موجود خلیجوں کو پاٹیں ۔ یہ کام صرف وہ دانشور کر سکتے ہیں جو خودشعوری کے وصف سے مالا مال ہوں ۔صرف خودشعوری ہی منجمد اور بگڑے ہوئے عوام کو ایک ایسے متحرک اور تخلیقی مرکز پر لا کھڑا کر سکتی ہے کہ جو عظیم فطانتوں کو تیزی سے وجود میں لا سکتا ہے اور عظیم جستوں کے لیے فضا ہموار کر سکتا ہے ۔ یہ جینیس تمدن کی پیدائش کے لیے ''اچھال تختے'' کا کام دے سکتے ہیں۔

ان خیالات اور پیغامات کے حوالے سے تیسری دنیا میں ایک ایسی نئی پود تیار ہوئی جو قومی اور مشرقی شعور سے مالا مال تھی ۔ اس پود کی جدو جہد اور مساعی کا اندازہ ہمیں ان معاشروں میں جنم لینے والی نئی سوچوں سے ہوسکتا ہے ۔اس نئی پود نے ٹیکنالوجی سائنس یا مادی قوت پر انحصار نہیں کیا بلکہ اپنے شعور کو بنیاد بنایا۔ جن ملکوں میں دانشوروں ،نوجوانوں اور لوگوں نے اپنے حقیقی شعور کو اپنے سماج کی تبدیلی کی بنیاد بنایا انھوں نے کامیابی کے زینے تیزی سے طے کیے ۔ وہ بڑی طاقتوں اور صنعتی ملکوں کی سیاست وقوت سے مرعوب نہیں ہوئے جاپان کے خلاف چین کی مزاحمت اور امریکہ کے خلاف ویت نام کی مزاحمت اور شاہ ایران کے خلاف ایرانی عوام کی مزاحمت اس امر کا کھلا ثبوت ہے کہ سامراج ،حکومتی جبر اور عوام دشمن ادارے اور تنظیمیں صرف اسی وقت تک فعال رہتے ہیں جب تک انھیں چیلنج کرنے والا کوئی نہ ہو ۔ جونہی انھیں چیلنج کر دیا جاتا ہے وہ کاغذی شیروں کی مانند ہوا کے جھونکوں سے اڑ جاتے ہیں

یہی وہ خودشعوری ہے جو جدید مشرقی مفکروں نے تیسری دنیا کے معاشروں میں آفاقی اقدار کے حوالے سے نوجوانوں کو عطا کی ۔ اقبال جدید ایجادات اور سائنس کی برکات کے مخالف نہیں تھے ۔ وہ یہ چاہتے تھے کہ یہ سب خیر و برکات استحصال سے پاک معاشرے کو وجود میں لائیں ۔انھوں نے جس نظام کا خواب دیکھا اس میں طبقاتی ناہمواری ، غلامی ، درندگی اور اخلاقی پستی نام کی کوئی شے موجود نہیں تھی ۔ ان کے فلسفے پر عمل کر کے تیسری دنیا کے عوام بالعموم اور مسلم دنیا کے عوام بالخصوص ان منزلوں کا سراغ لگا سکتے ہیں جن کا ذکر دنیا کے عظیم پیغمبروں ،صوفیوں ، ولیوں ، راہنماؤں اور روشن خیال انسان دوست دانشوروں کے خیالات و افکار میں ملتا ہے ۔ اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ مسلم معاشروں میں سیم و زر آقا نہیں رہیں گے ۔ یہاں کے تہی دست عوام اپنی امت کو وسعت دیں گے ۔ اشیا پرست معاشروں میں جو لوگ درویشوں کی مانند جیتے ہیں وہ بندۂ مزدور کی عزت وحرمت کے پاسدار ہوتے ہیں ۔ وہ غلاموں کو آزادی کی نوید سناتے ہیں ۔ وہ یورپ میں موجود مادی نظام میں حلال وحرام کی تمیز کرتے ہیں۔

یہ کہنا مبالغہ نہیں ہے کہ اقبال بیسویں صدی کے عظیم مسلمان مفکروں کے قائد ہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ ہماری صدی کے ہر مسلم مذہبی ، سیاسی ، عمرانی اور ادبی مفکر نے انھیں بلا جھجک خراج تحسین پیش کیا ہے ۔ اقبال صرف مقامی یا ملی مفکر ہی نہیں تھے آفاقی افکار کے حامل بھی تھے سو جب دنیا کے ہر خطے میں موجود

مستشرقین ان کی عظمتوں کو سلام کرتے ہیں تو ہمارے سر فخر سے بلند ہو جاتے ہیں کہ ہمارے علاقے کے فکری چراغ نے چار دانگ عالم میں کئی اور دیے روشن کر رکھے ہیں۔ اقبال میں ایسی کون سی خوبی ہے کہ انھیں عالمی سطح پر شہرت عام اور بقائے دوام کی سند عطا کی گئی ہے۔ یوں تو وہ جامع الصفات شخصیت کے مالک تھے اور ان کی ہر صفت کی نہ کسی گروہ یا طبقے کے لیے قابل تقلید و ستائش تھی لیکن ان کا اصل کارنامہ تو بھٹکی ہوئی ملت کی راہنمائی تھا۔ ہو سکتا ہے کہ اس خیال کو کلیشے کے زمرے میں رکھ کر یا کلیہ بازی کا شاخسانہ قرار دے کر غیر اہم سمجھا جائے لیکن اسی بظاہر غیر اہم سی بات میں وہ اہم نکتہ پوشیدہ ہے میں جس کی جانب آپ کی توجہ مبذول کروانا چاہوں گا۔ اسلام کی سربلندی کے لیے خالص مذہبی اپروچ تو قریبا تمام مسلمان مفکروں نے اپنائی لیکن ٹھوس حقائق کی روشنی میں ملی یا انسانی جہت نمائی کا فریضہ اکا دکا مفکروں نے انجام دیا۔ اقبال نے نئے زاویوں اور نئے حوصلوں سے یہ کام پایۂ تکمیل کو پہنچایا۔ نیا زمانہ تھا، نئے دشمن تھے، نیا میدان جنگ تھا اور نئے حریت پسندوں کی تلاش تھی۔ سو اقبال نے لکھا

ایک بلبل ہے کہ ہے محو ترنم اب تک
اس کے سینے میں ہے نغموں کا تلاطم اب تک

یہ نغمے انھوں نے پیر روم سے سیکھے اور اپنی ذات کو اس کے حرفوں میں تاؤ دے کر مستقبل بینی کی صلاحیت پیدا کی۔ بیمار ملت کی نبض پر ہاتھ رکھ کر مرض زوال کی تشخیص کی اور بتایا کہ ان کی بیماری کی جڑ مغربی نظام معاشرت و معیشت ہے۔ یہیں سے صارفیت کے اس نظریے کی طرف توجہ مبذول ہوتی ہے جس کی سائنٹفک بنیادوں پر مخالفت کا سہرا ان مفکروں کے سر ہے۔ اس ضمن میں اقبال نے اپنی شاعری میں بہت کچھ قلم بند کیا ہے۔ ان کا نقطہ نظر واضح تھا وہ کہتے تھے کہ: (۶)

مال را گر بہر دیں باشی حمول — نعم مال صالح، گوید رسول
گر نداری اندر ایں حکمت نظر — تو غلام و خواجہ تو سیم و زر

ترجمہ اگر تو مال کو دین کے لیے استعمال کرے گا تو وہ جائز ہوگا۔ رسول خدا صلی اللہ نے فرمایا ہے کہ مال صالح نعمت ہے۔

اگر تو اس حکمت پر نظر نہیں رکھتا تو، تو غلام ہے اور تیرا آقا سیم و زر ہے۔

ان کا یہ بھی کہنا تھا کہ: (۷)

از تہی دستاں گشاد امتاں — از چنیں منعم فساد امتاں
خواجہ نان بندۂ مزدور خورد — آبروئے دختر مزدور برد
در حضورش بندہ می نالد چو نے — بر لب او نالہ ہائے پے بہ پے

نے بجامش بادہ و نے در سبوست کاخ ہا تعمیر کرد و خود بکوست

ترجمہ:'' تہی دستوں سے امتوں کو وسعتیں ملی ہیں۔ ایسا منعم امتوں کو خراب کرتا ہے۔ امیروں اور آقاؤں نے بندہ مزدور کی روٹی کھالی ہے۔ وہ مزدوروں کی آبروئیں لے اڑے ہیں۔ ان کے حضور غلام بانسری کی مانند روتے ہیں ان کے لب متواتر فریادی رہتے ہیں۔ نہ تو ان کی صراحیوں میں شراب ہے اور نہ ہی پیالوں میں۔ انھوں نے محلات تعمیر کیے ہیں مگر خود کوچہ نشیں ہے''۔

اقبال نے سرمایہ دارانہ اور جاگیردارانہ معیشت کے خلاف جس شدید ردعمل کا اظہار کیا ہے وہ ہمیں حضرت ابوذر غفاری کے نقطہ نظر کی یاد دلاتا ہے اور یہ نقطہ نظر قرآن پاک سے ماخوذ ہے یعنی ضرورت سے زاید مال تقسیم کرنے اور سیم وزر جمع نہ رکھنے کے کے خدائی احکامات پر مبنی ہے۔

امیروں سے قوموں میں فساد برپا ہوتا ہے، وہ انسانی شخصیت کی اسلامی تعمیر کے اہم فریضے سے آگاہ تھے اور معاشرے کو احکامات الہیہ پر استوار دیکھنا چاہتے تھے۔ علامہ نے اس نظام کو خلاف دین فطرت قرار دیا جس میں امیر امارت کی بلندیوں کو چھوتے رہتے ہیں اور غریب ناداری کی پستیوں میں گرتے رہتے ہیں۔

انھوں نے ہمیشہ ان شخصیتوں کی مدح کی جنھوں نے حقیقی اسلام کی پیروی کرتے ہوئے مظلوموں، محکوموں اور مغلوبوں کے حقوق کی حمایت کی۔ وہ خود بھی حقانیت کے پرستار، انسانی قدروں کے محافظ، جہاد دوست اور درویش صفت تھے اور ان کے ممدوحین کی اکثریت بھی انھی صفات سے متصف تھی۔ جو ہستیاں علم اور عمل میں افضل تھیں اقبال نے ان کی کھلی تعریف کی۔ انھوں نے تقلید اور پیروی سنتِ رسولؐ کو ہمیشہ بنیادی اہمیت دی۔ وہ سمجھتے تھے کہ اس پیروی اور تقلید کی بدولت مسلمان مفکروں اور دانشوروں کی ایک کثیر تعداد نے دنیا سے مظلومی، مسکینی، یتیمی، بیوگی، درماندگی، عاجزی اور بے سہارگی کے خاتمے کے عظیم مشن کو اپنایا اور تاریخ اسلام میں ناقابل فراموش کردار ادا کیا۔ اقبال بوریا نشین فقیروں کی طاقت اور قوت کے قائل تھے۔ ان کا خیال تھا کہ یہ لوگ شان وشوکت کو زندگی کا معیار قرار دینے والے فرعونوں کے لیے کل بھی خطرہ تھے اور آج بھی ہیں۔ سادگی، انصاف اور انسان دوستی کی کیفیات سے مملو اقبال کے شعری تصورات نے ہندوستان، افغانستان، ایران اور وسطی ایشیائی ریاستوں کے لیے بالخصوص اور دیگر مسلم ممالک کے لیے بالعموم عہد نو میں زندگی گزارنے کا ایک نیا منشور مہیا کیا۔ وہ چاہتے تھے کہ جبر وستم اور پستی وغلامی کے شکنجوں میں جکڑے ہوئے لوگ یکجا ومتحد ہو کر اپنا انفرادی اور ملی وقار بحال کریں۔

آج معاشی دنیا میں مشین نے اتنی ترقی کر لی ہے کہ یوروپی طاقتوں نے نئے ورلڈ آرڈر کی اہمیت کو تسلیم ہی نہیں کیا اس پر فوری عمل کی ضرورت پر بھی زور دیا ہے۔ اس لیے کہ مشین جس سرعت سے مال پیدا کر رہی ہے اس کی کھپت کے لیے بھی اتنا ہی سکون بھرا اور وسائل سے معمور ماحول درکار ہے تا کہ چند اجارہ

دار دنیا بھر کی دولت سمیٹ سکیں۔ اقبال نے فضول خرچی، دولت پرستی، زراندوختگی کے خلاف بھرپور فکری آواز بلند کی۔ وہ ان لوگوں کو پسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھتے تھے جو سونا اور چاندی جمع کرتے تھے اور اسے عام انسانوں پر خرچ نہیں کرتے تھے۔ ایسے امیر کہنگی کے خریدار تھے، انقلاب کے ہنگامے انھیں راس نہیں آتے۔ اقبال یہ بھی کہتے تھے کہ: (۸)

ای خوش آں منعم کہ چوں درویش زیست　　در چنیں عصرے خدا اندیش زیست

وہ امیر خوش قسمت ہیں جو درویشوں کی مانند جیے اور انھوں نے ایسے زمانے (مادیت زدہ) میں خدا خوفی سے زندگی بسر کی۔

اقبال پس چہ باید کرد اے اقوام شرق میں کہتے ہیں: (۹)

تا ندانی نکتہ اکل حلال　　بر جماعت زیستن گردد وبال
آہ یورپ زین مقام آگاہ نیست　　چشم او بنظر بنوراللہ نیست
او نداند از حلال و از حرام　　حکمتش خام است و کارش ناتمام
امتے بر امتے دیگر چرد　　دانہ این کارد و آں حاصل برد
از ضعیفاں نان ربودن حکمت است　　از تن شان جان ربودن حکمت است
شیوہ تہذیب نو آدم دری است　　پردۂ آدم دری سوداگری است
این بنوک این فکر چالاک یہود　　نور حق از سینہ آدم ربود
تا تہ و بالا نہ گردد این نظام　　دانش و تہذیب و دین سودائے خام

ترجمہ: جب تک تو رزق حلال کا نکتہ نہیں جانے گا تیری جماعت پر زندگی وبال ہی رہے گی افسوس کہ یورپ اس مقام سے آگاہ نہیں ہے، اس کی آنکھ اللہ کے نور سے دیکھنے والی نہیں ہے۔
اسے حلال اور حرام کے بارے میں خبر نہیں ہے، اس کی حکمت خام ہے اور اس کا کام نامکمل۔
ایک قوم دوسری قوم پر پل پڑی، اس نے اناج اگایا اور وہ اس کا حاصل لے گئی۔
ضعیفوں کی روٹی اڑا لینا حکمت ہے، ان کے جسم سے روح نکالنے کو وہ حکمت کہتے ہیں۔
نئی تہذیب کا شیوہ آدم دری ہے آدم دری کا پردہ سوداگری ہے۔
یہ بینک کہ جو یہود کی چالاک فکر کا نتیجہ ہیں، وہ انسان کے سینے سے نور حق چھین لے گئے ہیں۔
جب تک یہ نظام تہہ و بالا نہیں ہوتا، دانش، تہذیب اور دین خام مال (ناکارہ) ہیں۔

اقبال مزید لکھتے ہیں: (۱۰)

شرق و غرب آزاد و ما نخچیر غیر　　خشت ما سرمایۂ تعمیر غیر

زندگانی بر مراد دیگراں　　　جاوداں مرگ است نے خواب گراں

''مشرق اور مغرب تو آزاد ہیں ہم ہی غیروں کا شکار ہیں، ہماری اینٹ غیروں کی تعمیر کا سرمایہ ہے۔ دوسروں کے مقصد کے لیے جینا، گہری نیند نہیں مرگ جاودانی ہے۔''

ہندیاں با یک دگر آویختند　　　فتنہ ہائے کہنہ باز انگیختند

تا فرنگی قومے از مغرب زمیں　　　ثالث آمد در نزاع کفر و دیں

''ہندوستانی ایک دوسرے سے برسر پیکار ہیں، انھوں نے پرانے فتنوں کو پھر سے جگا دیا ہے۔ یوں فرنگی مغربی زمین کے باشندے، کفر اور دین کے جھگڑے میں ثالث بن گئے۔''

سیاسیات حاضرہ نے بقول اقبال غلاموں کی زنجیر کو سخت تر کیا ہے۔ مغربی جمہوریت ملوکیت کا نیا روپ ہے۔ جب یوروپی ارباب نے جمہور کے ہنگامے کی گرمی دیکھی تو آزادی، انسانی حقوق اور نیشنلزم وغیرہ کے نام پر انسانوں کے درمیان تفرقہ پیدا کیا اور اپنے لیے نئی بندر بانٹ کی راہ ہموار کی۔ جمہوریت اور قوم پرستی کے نام پر انھوں نے اپنا کام پختہ کیا اور دیگر نظاموں کو ناپختہ قرار دیا۔ اقبال نے انسان سے بار بار یہ اپیل کی ہے کہ اگر وہ آزادی کا طلبگار ہے تو اسے یوروپی یا مغربی پیچاکوں میں نہیں الجھنا چاہیے۔ وہ کہتے ہیں: (۱۲)

حریت خواہی بہ پیچاکش میفت　　　تشنہ میر و بر نم تاکش میفت

الحذر از گرمئ گفتار او　　　الحذر از حرف پہلو دار او

چشم ہا از سرمہ اش بے نور تر　　　بندہ مجبور از او مجبور تر

از شراب ساتگینش الحذر　　　از قمار بدنشینش الحذر

از خودی غافل نہ گردد مرد حر　　　حفظ خود کن حب افیونش مخور

پیش فرعوناں بگو حرف کلیم　　　تا کند ضرب تو دریا را دو نیم

ترجمہ: ''اگر تو آزادی چاہتا ہے تو اس کے پیچاکوں میں نہ الجھ۔ پیاسا رہ لے لیکن اس کے انگوروں کی نمی میں نہ کھو۔

اس کی گفتار کی گرمی سے بچ۔ اس کے پہلو دار حرف سے حذر کر۔

اس کے سرمے سے آنکھیں اور زیادہ بے نور ہو جاتی ہیں۔ غلام انسان اس سے اور زیادہ غلام ہو جاتا ہے۔

اس کے پیالے کی شراب سے محفوظ رہ۔ اس کے جوئے کی ہرا دینے والی چال سے بچ۔

مرد حر اپنی خودی سے غافل نہیں ہوتا۔ اس کی افیونی گولی نہ کھا، اپنی حفاظت خود کر۔

فرعونوں کے آگے موسیٰ گفتار بن، تا کہ تیری ضرب دریا کو دو نیم کرے۔''

اقبال اس بات سے بھی نالاں تھے کہ مسلم قیادت نور روح سے خالی سیم پرست، جاہ مست اور کم نگاہ

ہے۔اس کا باطن خدا سے خالی ہے، ہمارے قائدین حرم میں پیدا ہو کر کلیسا کے مرید ہو جاتے ہیں۔ بانگ درا سے ارمغان حجاز تک اقبال نے اتحاد بین المسلمین پر بہت زور دیا اور اکثر فرمایا کہ مسلمان ایک قوم تھے اب کئی قوموں میں بٹ گئے ہیں۔اپنی بزم کو انھوں نے خود ہی ٹکڑے ٹکڑے کیا ہے۔انھوں نے خودی کی زنجیر سے چھٹکارا حاصل کیا اور اپنی موت کو آواز دی۔ وہ فرنگیوں کے ساتھ پیوست ہو چکے ہیں اور فرنگی افسوں سے بے خبر ہیں۔اگر انھیں اس جادو سے چھٹکارا حاصل کرنے کی تمنا ہے تو سب سے پہلے اجارہ دار مغربی طاقتوں کی آستین میں چھپے فتنوں کو پہچاننا ہوگا۔اقبال مسلمان سے کہتے ہیں: (۱۳)

از فریب او اگر خواہی اماں اشترانش را بہ حوض خود براں

ترجمہ:''اگر تو اس کے فریب سے امان چاہتا ہے تو اس کے اونٹوں کو اپنے حوضوں سے بھگا دے۔''

یوں اقبال کھل کر اس امر کا اظہار کر رہے ہیں کہ مغربی فلسفہ صارفیت نے مسلمانوں کو اشیا کا غلام بنا دیا ہے۔ وہ فاقہ کش اپنے مقام سے آگاہ نہ ہونے کے سبب دست فرنگ سے اپنی پاک جان کے عوض جو کی روٹی اور لات و منات خریدتے ہیں: (۱۴)

یورپ از شمشیر خود بسمل نہاد زیر گردوں رسم لا دینی نہاد
گرگی اندر پوستین برہ ئی ہر زماں اندر کمینِ برہ ائی

ترجمہ:''یورپ نے دنیا میں لادینیت کی طرح ڈالی ہے،اس نے اپنی ہی شمشیر سے اپنی شہ رگ کاٹ لی ہے۔ وہ تو ''بھیڑیے'' کی پوستین میں مستور بھیڑیا ہے۔ وہ بھیڑیا جو ہر پل ''بھیڑیے'' کی گھات میں ہے۔''

دانش افرنگیاں تیغ بدوش در ہلاک نوع انساں سخت کوش (۱۵)

ترجمہ:''فرنگیوں کی دانش نے تلوار سونت رکھی ہے جہاں کہیں انھیں انسان دکھائی دیتا ہے وہ اسے مارنے کے درپے ہوتے ہیں۔''

نئے یورپی سوداگر دیدہ دلیری سے ''بھیڑیے'' کے بھیڑیوں پر حلال ہونے کا فتوی صادر کر رہے ہیں۔(۱۶) (نیو ورلڈ آرڈر کے مقابلے میں)۔(۱۷)

نقش نو اندر جہاں باید نہاد از کفن دزداں ، چہ امید کشاد
در جنیوا چیست غیر از مکر و فن صید تو این میش و آں نخچیر من
نکتہ ہا کو می نہ گنجد در سخن یک جہاں آشوب و یک گیتی فتن

ترجمہ:''کسی نئے نظام کی بنیاد ڈالنی چاہیے۔اس کا سبب صرف یہ ہے کہ کفن چوروں سے فراخی قلب کی امید رکھنا بے سود ہے۔ جنیوا میں (بڑی طاقتوں کے باہمی سمجھوتے) مکر و فن کے سوا کچھ نہیں ہیں۔ یہ معاہدے بھی بندر بانٹ کے لیے ہوتے ہیں یعنی ایک طاقت کا شکار اگر بھیڑ ہے تو دوسری کا نخچیر دوسری۔

کئی آشوب روزگار اور فتنہ انگیز نکتے ان کی ظاہری گفتگو کا حصہ نہیں بنتے۔''

اقبال کے دور میں دنیا کے بیشتر ممالک پر مغربیوں کے براہ راست قبضے تھے۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد بہ امر مجبوری یہ پالیسی تبدیل ہوئی اور مشینی پیداوار کے ذریعے نو آزاد ممالک کی منڈیوں پر قبضے کیے گئے۔ اقبال نے ان کی اس روش کو بہت پہلے بھانپ لیا تھا۔ اور مغربی تہذیب و انداز معیشت کے ضمن میں کہا تھا: (۱۸)

زخم ازو ، نشتر ازو، سوزن ازو　　ما و جوئے خون و امید رفو
خود بدانی پادشاہی قاہری است　　قاہری در عصر ما سوداگری است
تختہ دکاں شریک تخت و تاج　　از تجارت نفع و از شاہی خراج
آں جہانبانی کہ ہم سوداگر است　　بر زبانش خیر و اندر دل شر است
گر تو می دانی حسابش را درست　　از حریرش نرم تر کرپاس تست
بے نیاز از کارگاہِ او گذر　　در زمستاں پوستینِ او مخر
کشتن بے حرب و ضرب آئین اوست　　مرگہا در گردشِ ماشینِ اوست
بوریائے خود بہ قالینش مدہ　　بیذق خود را بہ فرزینش مدہ
گوہرش تف دار و در لعلش رگ است　　مشک ایں سوداگر از ناف سگ است
رہزن چشم تو خواب مخملش　　رہزن تو رنگ و آب مخملش
صد گرہ افگندہ ئی در کار خویش　　از قماش او مکن دستار خویش
ہوش مندے از خم او مے نخورد　　ہر کہ خورد اندر ہمیں میخانہ مرد
وقت سودا خند خند و کم خروش　　ما چو طفلانیم و او شکر فروش
محرم از قلب و نگاہ مشتری است　　یاربّ ایں سحر است یا سوداگری است
تاجرانِ رنگ و بو بردند سود　　ما خریداراں ہمہ کور و کبود
آنچہ از خاک تو رست اے مرد حر　　آں فروش و آں بپوش و آں بخور
آں نکو بیناں کہ خود را دیدہ اند　　خود گلیم خویش را بافیدہ اند
اے ز کار عصر حاضر بے خبر　　چرب دستی ہائے یوروپ را نگر
قالی از ابریشمِ تو ساختند　　باز او را پیشِ تو انداختند
چشمِ تو از ظاہرش افسون خورد　　رنگ و آبِ او ترا از جا برد

وائے آن دریا کہ موجش کم تپید
گوہر خود را ز غواصاں خرید(۱۹)

ترجمہ: ''ہمارا زخم اس کی دین ہے، نشتر بھی اسی کا ہے، سوئی بھی۔ ہم ہیں، خون کی ندی ہے، اور رفو کی آس ہے۔

تو خود جانتا ہے بادشاہی غلبہ پانے کا نام ہے۔ ہمارے عہد میں سوداگری کا غلبہ ہے۔

دکان کا ایک تختہ تخت و تاج کا شریک ہے۔ تجارت کا مدار نفع پر ہے۔ اور بادشاہی کا خراج پر۔

آج کی دنیا کا حاکم سوداگر بھی ہے۔ اس کی زبان خیراندیش ہے اور دل شرپسند۔

تو اگر اس کی کاروباری دیانت کا مداح ہے۔ تو بس اتنا جان لے۔ اس کے ریشم سے تیری کپاس نرم ہے۔

اس کے کارخانے سے بے نیازانہ گزر جا۔ موسم سرما میں اس کی پوستین مت خرید۔

جنگ اور ضرب کے بغیر انسانوں کو قتل کرنا اس کا دستور ہے۔ اس کی مشینوں میں موتیں گردش کرتی ہیں۔

اس کے قالین کے عوض اپنا بوریا نہ دے۔ اس کے فرزیں کے بدلے اپنے پیادہ نہ مروا۔

اس کا موتی ناقص ہے اور اس کے لعل میں بال آیا ہے۔ اس سوداگر کی مشک کتے کی ناف سے نکلی ہے۔

تیری آنکھیں اس کی بنائی مخمل سے مسحور ہیں اور تو اس کے رنگ اور چمک کے ہاتھوں لٹ گیا ہے۔''

تو نے اپنے معاملے میں سو گرہیں ڈال لی ہیں۔ اپنی دستار کو اس کے ریشم سے نہ بنا۔

کوئی بھی ہوشمند اس کے مٹکے کی شراب نہیں پیتا۔ جس نے اسے چکھ لیا وہ وہیں، اسی شراب خانے میں دم توڑ گیا۔

وہ مسکراتا زیادہ ہے اور شور کم مچاتا ہے۔ ہم بچوں کی مانند ہیں اور وہ چینی بیچ رہا ہے۔

وہ گاہک کے قلب ونگہ سے آشنا ہے یارب یہ سوداگری ہے یا جادوگری۔

رنگ اور خوشبوؤں کے تاجر منافع سمیٹ لے گئے۔ ہم ان کے اندھے اور ناشناس خریدار ہیں۔

اے آزاد انسان جو کچھ تیری مٹی میں نمو پاتا ہے۔ اسے بیچ، اسے پہن، اسے کھا۔

وہ نیک روحیں کہ جنہوں نے اپنے آپ کو پہچان لیا ہے۔ انھوں نے اپنی گدڑی تک خود بنائی ہے۔

تو کہ عصر حاضر کے وتیرے سے بےخبر ہے۔ کھلی آنکھوں سے یورپ کی چیرہ دستیاں دیکھ۔

وہاں کے تاجروں نے تیرے ابریشم سے قالین بنائے اور پھر انھیں بیچنے کے لیے تیرے سامنے لا ڈالا۔

تیری آنکھ نے اس کے ظاہر سے دھوکا کھایا تجھے اس کے رنگ اور چمک نے کہیں کا نہ رکھا۔

حیف ہے اس دریا پر کہ جس کی موج میں تڑپ کم تھی۔ اس نے اپنے ہی موتی کو غوطہ خوروں سے خریدا۔''

اقبال کے اس پیغام کی روشنی میں آج پسماندہ مسلم ممالک کے لیے پہلے سے کہیں زیادہ ضروری ہے کہ وہ مغرب اور ان کے حلیفوں کے تاجرانہ اور صارفانہ چنگل سے باہر نکلیں اور خود انحصاری اور قناعت کے راستے پر چل کر اپنی دولت اور تہذیب کو برباد ہونے سے بچائیں۔ اپنی تجارتی پالیسیوں پر نظر ثانی کرتے ہوئے مسلم علاقوں پر مشتمل عالمی مسلم مارکیٹ کے قیام کے لیے کوشاں ہوں۔ اپنے معاشی اور علاقائی دفاع

کے لیے مل جل کر منصوبے بنائیں اور اس دولت کو واپس لینے کا لائحہ عمل تیار کریں جو مختلف حیلوں بہانوں سے مغربی ہم سے چھین لے گئے ہیں۔ بوسنیا، کشمیر، قبرص، فلسطین اور دیگر مسائل کو مغربیوں کی اعانت مفادانہ سے بچ کر اپنے وسیع تر مفاد میں خود حل کر سکیں۔

❁.....❁.....❁

حوالہ جات وحواشی

۱- علی شریعتی، ڈاکٹر، تہذیب ، جدیدیت اور ہم (منتخب مضامین ڈاکٹر علی شریعتی)، مترجم ڈاکٹر سعادت سعید، مطبوعہ، اقبال شریعتی فاؤنڈیشن لاہور، جنوری ۱۹۹۱ء، ص ۴۹

۲- تہذیب ، جدیدیت اور ہم، ص ۵۴

۳- فرانز فینن، افتادگان خاك، مترجم، محمد پرویز، سجاد باقر رضوی، نگارشات، لاہور ۱۹۶۹ء ص ۷

۴- افتادگان خاك، ص ۷

۵- اقبال لاہوری، مولانا، کلیات ، اشعار فارسی ، کتاب خانہ سنائی، ص ۳۹۱

۶- ایضا، ص ۴۱

۷- ایضا، ص ۴۱

۸- ایضا، ص ۴۱

۹- ایضا، ص ۴۱، ۴۲

۱۰- ایضا، ص ۴۴

۱۱- ایضا، ص ۴۴

۱۲- ایضا، ص ۴۵

۱۳- ایضا، ص ۴۸

۱۴- ایضا، ص ۴۹

۱۵- ایضا، ص ۴۱

۱۶- ایضا، ص ۴۱

۱۷- ایضا، ص ۴۱

۱۸- ایضا، ص ۴۱

۱۹- ایضا، ص ۴۱، ۴۲

❁.....❁.....❁